اقبال کا تصور شخصیت

اور

انائیت سے اس کا تقابل

عبدالحمید کمالی

انائیت توسیع ذات کا فلسفہ ہے ، اپنے اچھے اور برے دونوں معنوں میں ۔ معاشیات میں یہ مفاد کوشی کے مترادف ہے ، سیاسیات میں جنون اقتدار کے ، اور وجودیات میں اس سے مراد کلیت پسندی ہے یا حب ذات ۔ اقبال کے افکار اقتصادیات میں لذت پرستی ، سیاسیات میں جلب اقتدار اور روحانیات میں فنائے وجود یا استیصال ہستی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے ۔ ان کا فلسفہ' خودی فلسفہ' انائیت سے ہر طرح منفرد و مختلف ہے ۔ چنانچہ اقبال کے تصور شخصیت اور محبوس بہ انا شخصیت میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہے ۔

عام محاورہ میں شخصیت کا مصداق جیتا جاگتا چلتا پھرتا آدمی ہے ۔ اس کے مقابلہ میں انا کا احساس ایک مجرد اندرونی کیفیت یا حال ہے ، جو خواہ کتنی ہی گھمبیر ہو ، بھرپور شخصیت کا پاسنگ بھی نہیں ہوتا ۔ جیتا جاگتا آدمی بجائے خود ایک عالم ہے ۔ انگنت میلانات ، تموجات ، ہیجانات ، تصورات ، تخیلات ، ارتسامات اور اعمال کی ایک دنیا جو اصلی اور ٹھوس ہے ۔ شخصیت اس کے عناصر کا مرتب نظام ہوتی ہے ۔ اگر انا سے مراد 'میں ہوں' ہے تو شخصیت عرف عام میں 'میں کیا ہوں؟' کا جواب ہے ۔

ہندی دانش کا شمار دنیائے قدیم کے سب سے زیادہ معزز افکار میں ہوتا ہے مگر عجیب بات ہے کہ اس دانش کے وسعت خیال میں ''شخصیت'' کی قدر سرے سے ناپید ہے ۔ اس کی بلند ترین معنی آفرینی میں بھی شخصیت زیادہ سے زیادہ مایا کا ایک داؤں معلوم ہوتی ہے ۔ چنانچہ شخص ہوناھی وہ شئے ہے جو رات دن کے چکر میں مبتلا کرتی ہے ۔ جو شعور اس کے دام سے نکل گیا وہ لامحدود ہوجاتا ہے اور جب پرم آتما یا برھما کے حضور پہنچتا ہے تو اس سے یوں کہتا ہے ''جو تو ہے وہ میں ہوں'' ۔ اور پھر اس سے آگے نہ تو نہ میں۔ یہ نروان ہے ۔ سب کرشمہ' خیال تھا یا پھر آشاؤں کا کھیل ۔

یونانی فلسفہ دوسرا دریائے فکر ہے، اس کے مد و جزر میں حقیقت کبریٰ کی طرف بھی غواصی ہو سکی کہ وہ ''سرمدی شعور'' ہے۔ یہاں بھی تصور شخصیت کا گوہر شہوار ہاتھ نہیں لگتا ۔ صرف اسلام نے ہی ایسے جیتے جاگتے خدا کا تصور پیش کیا جس پر شخصیت کا پورا اطلاق ہوتا ہے اور شخصیت بھی کیسی ؟۔ تمام اچھے نام اس کا نشان ہیں ۔

دراصل انسانی دانش کی تاریخ میں اسلام ایک عظیم الشان ذہنی انقلاب کا سرچشمہ ہے جس نے ہندی، مجوسی، یونانی، اسکندریائی اسالیب کی طرح شعور ذات پر نہیں بلکہ تصور شخصیت پر مذہبی واردات، جمالیاتی احساسات اور اقدار حیات کی تاسیس کی اور بنی آدم کے لئے فکر و عمل کے نئے افق روشن کئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا فکری نظام نظریہ تنزلات کا متحمل نہیں بن سکتا ؛ خواہ یہ نظریہ ہندی تپسیہ کی آگ میں پختہ ہوا ہو یا یونانی اکادیمی کی بھٹی میں ڈھلا ہو، اسکندریائی صناعت ہو یا جدید مغربی طرح اندازی ۔ چنانچہ اس کے ادراکات میں 'نرگن پرم آتما' اور 'سگن پرم آتما' کی تفریق نہیں در آسکتی ۔ سگن پرم آتما ، نرگن پرم آتما کا نیچے اترنا ہے۔ اسی طرح احدیت ، واحدیت ، اور وحدت کے امتیازات پر بھی ہبوط خداوندی کے سے افکار کا پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہے۔ وہ ایسی غیور شخصیت ہے کہ جسکا پیمانہ نہیں چھلکتا ۔ یہ خیال کہ اس نے احدیت سے واحدیت کے کوچہ میں قدم رکھا اور پھر وہاں سے وحدت میں نزول اجلال فرمایا اسلام کے گلشن معانی میں ہوائے پریشان کا ایک جھونکا ہے۔ دراصل ذات باری کے لئے ''اوتار'' کے تصور کا ابطال اسلام کے لائے ہوئے ذہنی انقلاب کا سنگ بنیاد ہے۔ ہبوط و صعود کی کمندیں ذات حق کے کاخ بالا حصار تک نہیں پہنچتیں ۔ وہ ذات ہر قسم کے مدارج سے بہت بلند اور سب اتار چڑھاؤ سے ماوریٰ ہے۔ اس کی شخصیت کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ۔ یہ اسلام کا نظریہ' صمدیت ہے جو دلالت کرتا ہے کہ شخصیت ذات باری کسی اکتساب کا پھل نہیں ہے اور نہ وہ خود اس کے اپنی ذات پر فیضان کا نتیجہ ہے۔ اس صمدیت کے برعکس خود ہم بھی شخصیت ہیں مگر کیسی؟ ہماری شخصیت اکتساب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ حاصل فیضان ہے ، خود ہمارا اپنے اوپر فیضان اور پھر دوسروں کا فیضان ۔ اس طرح ہماری شخصیت اور شخصیت ذات باری میں وجودی فرق ہے۔ اس کے اعمال اس کی شخصیت کے آیات ہیں ۔ جب کہ ہمارے اعمال شخصیت کے وسائل ۔

من و تو ناتمامیم او تمام است

(سوال هفتم گلشن راز جدید)

اگرچہ شعور ذات پوری شخصیت کا صرف ایک اعتبار بلکہ یوں کہئیے ایک نشان ہے مگر عجمی افکار نے اس کے باب میں بہت غلو کیا ہے۔ اس کا مرتبہ بڑھاتے بڑھاتے اس کو پوری ذات کا سنگ بنیاد قرار دے دیا۔ جدید مغربی فکر بھی جو اپنے میلان میں عجمیت سے چنداں مختلف نہیں بلکہ اسی کی ایک ترقی یافتہ شرح و تدوین ہے اسی مبالغہ آرائی کا شکار ہے۔ ہیگل شعور ذات میں صبح ازل کی نمود دیکھتا ہے جس کی شام ظہور شخص مطلق کا اتمام ہے۔ گویا شعور ذات بیج ہے اور تمام وجود درخت۔ ہیگلی انداز کے جملہ فلسفے جو در اصل پوری جدید مغربی فکر کے بلند بام سحابیے ہیں تمام حقیقت کو ایک شخصیت واحدہ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ شخصیت کلی ابھی حالت تکون میں ہے جو بہ بہ بہ منزل بہ منزل اپنی وحدت کی تشکیل و تحقیق کر رہی ہے۔ جب یہ اپنی نہایت کو پہنچ جائے گی تو کل وجود ذات مطلق کہلائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب پوری حقیقت ایک ہی ذات یا شخصیت مطلق ہو تو اس میں متعدد اشخاص کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ انسان بحیثیت شخص اس میں بار نہیں پا سکتا یہ فلسفہ دور حاضرہ کا وحدت الوجود ہے۔ شوپن ھاور اس میں یوں پیوند لگاتا ہے کہ اصل بیج شعور ذات نہیں بلکہ ارادہ بے کیف ہے باقی ساری منطق وہی ہے۔ ھارٹ مین اس میں یہ اضافہ اور کرتا ہے کہ اس تقویم سے سوائے الم میں اضافہ کے اور کچھ حاصل نہیں۔ چناں چہ ارادہ جوں جوں سمجھ دار ہوتا جائے گا ویسے ویسے اس جنجال سے نکلنے کے لئے بیکل ہوگا اور آخر کار بحر سکوت میں ڈوب جائے گا۔ یہ ہے سب حقیقت کا انجام خیر! ان نظریاتی کاوشوں میں بہر حال واحد شخصیت کے تصور میں ہی حقیقت کے تمام رنگ نکھارے جاتے ہیں اور اسی سبب سے ان میں سے کسی کے اندر انسان کے لئے شخصیت کے تصور کی گنجائش نہیں ہے۔

اقبال کا فلسفہ جیسے جیسے ارتقا پذیر ہوتا ہے رفتہ رفتہ اس قسم کے فلسفوں کے اثرات سے نکلتا جاتا ہے اور بجائے خود افکار کا ایک دریا بنتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تہ سے ایک ایسا در نایاب ابھر کر سطح پر آتا ہے جس کی جوت سے انسان اس احساس سے جاگ اٹھتا ہے کہ حقیقت متعدد اشخاص پر مشتمل ہے: خدا بھی شخصیت ہے اور ہم انسان بھی۔ یہ احساس ہے یا شعور؟ فلسفہ اقبال میں در اصل یہ ایک وجودیاتی کشف ہے۔ یہ ایسا ناقابل تردید اور تشریح ناپذیر وجودیاتی کشف ہے جس کے دامن میں تمام حقیقت آ جاتی ہے۔ چوں کہ اس فلسفہ میں یہ فکر کی انتہا ہے اس لئے اس کے بارے میں اقبال زیادہ سے زیادہ جو کہہ سکے وہ یہ ہے کہ شخص ہونے میں یہ لطیفہ موجود ہے کہ متعدد اشخاص کا اس سے فیضان ہو، اکیلا پن اس کی نورانیت سے میل نہیں کھاتا اس لئے کثرت

اشخاص سے وجود کی بزم کا آراستہ ہونا اسے پسند ہے ۔ فلسفہ جب اپنی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہے یعنی اصول عامہ میں قدم رکھتا ہے تو استدلالی نہیں رہتا ، بیانی بن جاتا ہے ، اسی کو ہم فلسفہ کا وجدانی افق کہتے ہیں ۔ اقبال نے " گلشن راز جدید " میں اپنے فلسفہ کے متذکرہ بالا رخ بیانیہ کو اس طرح ادا کیا ہے " میں اور وہ کیا ہیں؟ الہی اسرار ہیں ۔ میں اور وہ (کا وجودیاتی فرق) میرے دوام پر شہادت ہیں ۔ جلوت میں خلوت نور ذات ہے ۔ انجمن کے درمیان ہونا حیات ہے ۔" آگے چل کر کہتے ہیں " خدائے زندہ ذوق سخن سے کورا نہیں ہے (چناں چہ) اس کی تجلیاں بے انجمن نہیں ہیں ۔ اگر ہم ہیں تو ساقی کا پیمانہ گردش میں ہے (اور) اس کی بزم کی گرمی ہنگامہ باقی ہے " ۔ اس کے بعد اقبال بڑے لطیف پیرائے میں اس نکتہ کو کھولتے ہیں کہ انسان کو تعمیر ذات کے لئے کیوں سرگرم ہونا چاہئے ۔ " میرا دل اس کی تنہائی سے راکھ ہو جاتا ہے اس لئے اس کی بزم آرائی کا سامان کرتا ہوں ۔ دانے کی طرح میں خودی کی کاشت کرتا ہوں ۔ اس کے لئے اپنی خودی کی نگہداشت کرتا ہوں ۔ " اگر منطقی سطح کا تعین کیا جائے تو اس قسم کے بیان کو فلسفہ اقبال کے اعتبار سے علوم متعارفہ کا درجہ حاصل ہوگا ۔ یعنی افکار اقبال میں یہ وہ اولیات ہیں جن سے اس کے تمام حقائق کی عقدہ کشائی ہوتی ہے مگر ان کا خود کوئی عقدہ کشود نہیں ہوتا ۔ بالفاظ دیگر وہ بسیط ترین وجدانی اساس ہیں جن پر جملہ مقدمات اور تصورات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور اس طرح اقبال کی صوری وجودیات کا خاکہ مکمل ہوتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس وجودیات کا مافیہ کیا ہے ؟ وہ کونسی حقیقت ہے جو اس صوری خاکہ میں از خود سما جاتی ہے یا جس کی سروقامتی پر اس کی قبائے نو تراش اس طرح پوری اترتی ہے کہ چار سو اجالا پھیل جاتا ہے اور اس کی نور افشانی سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں ۔ فلسفہ اقبال میں وہ لالہ رخ " عشق " ہے ۔ ہم اپنے وجدانات و مشاہدات کے گوشہ گوشہ میں تلاش کریں ۔ ہر اس تجربہ کو اٹھائیں جو اساسی معلوم ہو اور اس وجودیات کے خاکے میں اسے جمانے کی کوشش کریں ، حق یہ ہے کہ کسی تجربہ میں وہ آہنگ نہیں جو اس میں درست ہو ۔ ہاں مگر حقیقت عشق میں ہمیں ایسی واردات کا تجربہ ہوتا ہے جو بے محابا اس خاکہ میں بار پاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ نوفلاطونیوں نے حقیقت کی کنہہ کو " تجربہ نور " میں دریافت کیا تھا ، ہیگل نے " شعور " میں ، شوپن ہاور نے " ارادہ " میں ، برگساں نے "خلاق عمل" میں ، لیکن اقبال نے "عشق محض" کے التہاب میں اس کو دریافت کیا ۔ بالفاظ دیگر اقبال کا کشف یہ ہے کہ تمام تجربات میں صرف عشق کا تجربہ ہی وہ اصل الاصل ہے جو تمام کائنات کا عقدہ کشود ہے جو تمام موجود کی حقیقت ہے ، جو تمام گیتی کا سر اول و آخر ظاہر و باطن ہے ، صرف اسی کے وجودیاتی فکر و تامل سے ہستی کی گرہ کشائی ہوسکتی

ہے ۔ اس اعتبار سے اقبال تمام مشہور فلسفیوں سے، جیسا کہ اوپر گزرا ، ممتاز ہیں ، فر فریوس سے ، برکلے سے ، ہیگل سے ، شوپن ھاور سے اور برگسان سے ۔

ہماری شاعرانہ روایات میں عشق سب سے پائمال اصطلاح ہے ۔ درویش مولا مست سے لے کر رند بازاری اور شاھد خردہ گیر تک ہر ایک کی زبان پر عشق کا کلمہ جاری ہے ۔ مگر تاریخ فکر اسلام میں اقبال پہلے مفکر ہیں جنھوں نے اس پائمال اصطلاح کو ما بعد الطبیعیات اور علم الوجود کے صدر میں جگہ دی ۔ خواہ صوفی کی خانقاہ ہو ، یا کوچہ' شہر ، عام استعمال میں عشق ایک کیفیت کا نام ہے جس کا جوش و جذبہ سے تعلق ہے ۔ کسی کو دل کی گہرائیوں سے چاھنا یا کسی کے جلوؤں میں محوگشت ہو جانا یہ عشق ہے ۔ ہمارے داناؤں نے کچھ اور ترقی کی تو اس کو چاھت و لگن کے مفہوم سے بلند کر کے ایک وسیلہ' علم یا باب معرفت قرار دیا ۔ روحانی سلسلوں میں یہ زیادہ تر اسی معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ ان کے ادب میں گو عقل علم کا ذریعہ ہے مگر عشق کہیں بڑے اور گہرے علم کا ذریعہ ہے ۔ اقبال کے ھاں بھی اس مفہوم کے شعر ملتے ہیں مگر ان کے ھاں علم و عشق کا معرکہ یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتا ۔ وہ سنائی اور عراقی سے کہیں دور کی بات کرتے ہیں ۔ چناں چہ وہ عشق کو علم تک نہیں بلکہ خود عین وجود یعنی سرکائنات تک لے جاتے ہیں ۔ تمام بود و نابود کے پیچھے جو قوت سرگرم کار ہے وہ عشق ہے ۔ ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ افلاطون ، ارسطو ، اور ان دونوں سے زیادہ واضح بو علی سینا نے اس قسم کی مفہوم آرائی کی ہے کہ ان کا ایک رسالہ خاص عشق پر موجود ہے ۔ ان کے افکار کے مطابق کائنات کی ہر شی' میں آرزو یا عشق ہے چناں چہ ہر شی' حسن کامل کی طرف بڑھ رہی ہے ۔ پھر رومی جو اپنے ارتقائی خیال کے لئے بہت مشہور ہیں وہ بھی کائنات میں ارتقاء کو حسن کامل کی طرف تیز گامی تصور کرتے ہیں ۔ پھر اقبال نے کون سا نیا خیال پیش کیا؟ یہ ایک اچھی تنقید ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے اقبال اور دوسرے آئمہ' فلسفہ کا فرق پورے طور پر جاننے میں مدد ملتی ہے ۔ جواب یہ ہے کہ اقبال یوں منفرد ہیں کہ ان کی مابعد الطبیعیات اپنے افکار میں '' حسن خداوندی '' کی وجودیات اور کائنات کے شوق پرواز کی دوئی پسند وجودیات سے کہیں بکجائی اختیار نہیں کرتی ۔ ان کا اصول موضوعہ اس ضمن میں بہت واضح ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خود باری تعالی اپنے عین وجود میں '' عشق '' ہے ۔ اس طرح عشق باب علم سے نہیں بلکہ باب وجود سے ہے ۔ ذات باری عشق خالص ہے اور یہی عشق تمام وجودیاتی لمحات کی قوت شاکلہ ہے ، مظاھر میں حقیقت فعال ، اور جملہ ھست و نیست میں سر الاسرار ہے ۔

یہ عشق ہی ہے جس کے پیمانہ میں تعدد پسندی کا لطف ہے اور جس کے

سبب حقیقت تامہ متعدد اشخاص پر مشتمل ہے - اس کثرت میں ہر شخص اپنی نہایت میں عشق کا ایک نقطہ نورانی بنتا ہے ، چناں چہ خود اس کی سرشت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ حقیقت کثرت ہو اور متعدد اشخاص پر مشتمل ہو - غرض اس بے غرض اور بے ہمہ نامتناہی ذات سبحانہ لاشریک لہ نے جو خود عشق نامتناہی ہے عشق کے بے شمار چراغ روشن کئے ہیں - ہر چراغ ناصبوری کا ایک شعلہ ہے - اپنی فطرت میں تب و تاب ، سوز و گداز ہے - اقبال کہتے ہیں :

جہان از عشق و عشق ازتست   سرورش از مئے دیرینہ تست

ان کے فلسفہ میں تمام تفرید اور تشخص کا جوہر اور وجودیاتی اصول عشق ہے چناں چہ تمام افراد اپنے باطن میں عشق ہیں - تموج شوق انہیں زبر و زیر کرتا رہتا ہے - اقبال کہتے ہیں کہ " میں اور تو یزدان کا لگایا ہوا کھیت ہیں - بس سب کا یہی حاصل ہے - یہی زندگی کی دلہن کا محمل ہے - محبت بے انجمن دیکھنے والی نہیں بنتی اور نہ انجمن بنا اپنے کو پہچاننے والی ہوتی ہے " - لا متناہی عشق کے زیر قدم ہم سب انسان ، من و تو کا یہ ہنگامہ وجود کے متناہی مراکز یا دھکتے ہوئے عشق کی چنگاریاں ہیں اس لئے کسی کو قرار نہیں ہے - اس خیال کو اقبال نے یوں رقم کیا ہے " تو کہتا ہے کہ دل خاک اور خون سے ہے - کاف و نون کے طلسم میں گرفتار ہے - (میں کہتا ہوں) دل اگرچہ میرے سینہ میں ہے لیکن میری دنیا سے باہر ہے -" دل کی یہ ماورائیت اپنے نہاں خانہ سے باہر کی طرف لپک عشق کی بدولت ہے - اس کا رقص بسمل پکار پکار کر کہتا ہے :

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی   اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اسی لئے ٹھیراؤ فطرت وجود سے بعید ہے - اقبال نے عشق عین الوجود کے بہت سے نکتے واضح کئے ہیں - اس کی جدلیت سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے ، جیتے جاگتے انسان کا ضمیر اٹھتا ہے - وہ کہتے ہیں کہ " جدائی اس کے مقامات وصال میں سے ہے اور وصال اس کی جدائی کے مقامات سے ہوتا ہے - " اس جدلیت کا بدیہی شعور مامتا کے احوال سے ہوتا ہے - ہر ماں میں یہ تڑپ ہے کہ اس کا بچہ خود اس کا محتاج نہ رہے ، اپنے آپ چلنے پھرنے کے قابل بنے ، پھلے پھولے اور بڑھے - یہ محبت ہی ہے اور محبت کے سوا کوئی شے نہیں ہو سکتی جس کے وصال کا کمال مقامات جدائی اور جس کی جدائی میں مقامات وصال ہوتے ہیں - اس محبت کا تجربہ ماں باپ میں ہوتا ہے نیز سچے عزیزوں اور دوستوں میں ہوتا ہے -

محبت کی اس جدلیت کا بار افلاطون و ارسطو اور فرفریوس کے نظریات سے لے کر ہیگل ، شیلنگ اور برگساں کے فلسفوں تک کوئی نہ اٹھا سکا - ہمارا

صوفیانہ ذوق اور زھد شکن شاعری بھی اس کا حق ادا نہ کر سکے - ان کے ھاں محبت فنا کاری کا عمل ہے " تاکس نہ گوئید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری-" حالاں کہ عشق کی مظہری تحلیل ھی سے یہ رمز روشن ہو جاتا ہے کہ محبت وجود ساز عمل ہے جو محبت کرنے والی ذات کو عظمت عطا کرتی ہے اور جن سے محبت ہوتی ہے ان کو سرفراز کرتی ہے اور شکوہ عطا کرتی ہے - یہ ایک سوز ناتمام ہے جو ذات محب کو خود اپنے خیال میں گم رکھتا ہے کہ کیا کرے دوسری طرف یہ ذات محبوب کے خیال میں گم رکھتا ہے کہ کون کون سی شان اس میں ہو - وجوداً محبت یا عشق متعدد اشخاص کی جدلیت ہے اور اسی جدلیت سے جملہ شخصیت کی تاسیس و تعمیر ہوتی ہے -

اس جدلیت کا دوسرا رخ لامتناھیت ہے- فلسفہ' اقبال میں کائنات ہمیشہ ناتمام ہے - یہ ارتقا' کا نہ صرف ظاھری بلکہ باطنی رخ ہے اس لئے کہ عشق سرد نہ ہونے والی آگ ہے - اور کائنات اپنے بطون میں عشق ہے - وہ کون سا تجربہ ہے جو تمام نہیں ہوتا - معلومات کے حصول پر علم تمام ہو جاتا ہے - چناں چہ اگر ذات خداوند علم ھی علم ہے تو اس کی ذات کی ضرور انتہا ہے- جو لوگ انا کو شعور قرار دیتے ہیں ان کو جاننا چاہیے کہ شعور تمام چیزوں کے شعور سے کمال کو پہنچ جاتا ہے ، اگر انا ارادہ ہے تو اپنی مراد کو پہنچ کر تمام ہو جاتا ہے - اصل کائنات اگر ایک کارفرما ارادہ ہے تو کائنات کی انتہا دور نہیں اپنی مراد کو پہنچ کر ٹھہر جائے گی. صرف عشق ھی وہ برق آسا تجربہ ہے جس کو کوئی انتہا چھو نہیں سکتی- کسی مقام پر وہ تمام نہیں ہوتا- وہ ہر آن سکون ناآشنا ہے - یہی وجہ ہے کہ بزم کائنات کے امکانات لامحدود ہیں- اقبالی تصور کائنات میں عشق کا وجودی اصول ھی اس بات کا ضامن ہے کہ کائنات کی کوئی منزل نہیں اور نہ اس کے احوال کی کوئی انتہا یا نہایت ہے- " اللہ کرے مرحلہ' شوق نہ ہو طے - " یہی عالمگیر وجودیاتی اصول اقبال کے تصور شخصیت کی بنیاد ہے -

عشق اور خودی عین یک دیگر ہیں - جہاں کہیں عشق کا تجربہ ہے وہ در اصل خودی کا تجربہ ہے یعنی عشق کی وجودی صورت ایک اور صرف ایک ھی ہے اور وہ خودی ہے - اس کے علاوہ کوئی صورت اس کا پیکر نہیں بن سکتی - نفس عشق اور صورت عشق کی یہ تفریق صرف سمجھنے سمجھانے کے لئے ہے ورنہ تو نفس اور صورت عشق ایک ھی حقیقت ہے - آپ اسے خودی کہیئے یا عشق کوئی فرق نہیں ہے - چناں چہ عشق کا ہر تجربہ فعال خودی کا تجربہ ہے اور عشق وجوداً خود خودی ہے - بالفاظ دیگر میں کا جوہر عشق پر مشتمل ہوتا ہے - اور سب سے بڑا میں ، سب سے بڑا عشق خود ہستی خداوند ہے جو اصلی ذات مقرون

ہے اور وہ نور ہے جو انجمن آرائی کرتا ہے۔ یوں ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوتا ہے۔ اور بزم کائنات کا نقشہ جمتا ہے۔ بزم کائنات اسی عشق کی مترون صورت ہے۔

ع در دو عالم ہر کجا آثار عشق ابن آدم سرے از اسرار عشق
(جاوید نامہ : خلافت آدم)

ان وجودیاتی افکار کا مقابلہ ہم ہیگلی جدلیت سے کرتے ہیں تاکہ علم الوجود کے نقطۂ نظر سے اس کی امتیازی خصوصیات اور اجاگر ہوں ۔ نٹشے اور ہیگل کا فلسفہ بھی در اصل اناثیت کا فلسفہ ہے اور شوپن ہاور کا فلسفہ بھی در اصل انا کی جدلیت ہے۔ ہیگلی وجودیات میں علم کو اصل وجود قرار دیا گیا ہے اس لئے اس میں انا کی تمام حقیقت در اصل علم کی جدلیت یا منطق کا عین ہے وہ اس طرح کہ علم اپنے جدلی عمل میں حقیقت کی دو طرفوں کا تعین کرتا ہے : عالم اور معلومات ۔ عالم ایک فاعلانہ قوت ہے اور معلومات محض انفعال پذیر معطیات جو عالم کے حضور میں سر نگوں ہوتے ہیں ۔ ذات عالم ان میں نافذ ہوتی ہے ان کو تسخیر کرتی ہے اور اپنے قالب کا جزو بناتی ہے۔ چناں چہ اس فلسفہ میں عالم اگر ذات ہے تو معلومات اپنے اثبات اور انجام میں غیر ذات ۔ ان کا وجود ہی اس طور ہے کہ وہ ذاتیت سے محروم صرف عالم سے وابستہ ہو کر ہی موجود ہو سکتی ہیں۔ چناں چہ وہ عالم کی شخصیت کا اساسۂ وجود ہیں اور اس کی توسیع ذات کا سامان۔ تصوریتی یا ہیگلی فلسفہ میں اس امر کو تحقق ذات اور تکمیل وجود کہا جاتا ہے یعنی فردیت یا شخصیت کا ارتقاء جس میں آگہی کے جملہ معطیات اور شعور کے ہر معروض کا کام ذات عالم یا موضوع میں فنا ہو کر اس کی شان میں اضافہ کرنا ہے۔ اہل تصوریت میں یہی امر ساری کائنات اور اس کی تمام اشیاء کی ماہیت ہے ، اس کو وہ غیریت سے عینیت میں تحویل کرنا کہتے ہیں ۔ کائنات کے زیر و بم تازہ بہ تازہ حادثوں میں یہ عمل ان کے افکار کے مطابق پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ شکست و ریخت تعمیر و تشکیل کا یہ بے پناہ عمل سب کو رفتہ رفتہ انائے واحد کے منظم مظہر میں متغیر کر رہا ہے۔ یہ انائیت کا ارتقاء ہے جس سے کائنات عبارت ہے۔

عقل و شعور کے اس عمل پر اگر ہم معلومات کی طرف سے نظر ڈالیں تو ایسا نظر آئے گا کہ سب معطیات اپنی جگہ سے سرک رہے ہیں ، حال سے بے حال ہو رہے ہیں ، کوئی قوت انہیں کھینچ رہی ہے ، چناں چہ ان کی حدیں ٹوٹتی جاتی ہیں ، ان پر ہلاکت کا عالم طاری ہوتا ہے اور بالآخر وہ معطیات فنا ہو جاتے ہیں اور فنا ہو کر وجود فاعل کی سیمیائی اس کی اپنی کیفیت یا حال بن جاتے ہیں۔

چناں چہ عالم معروض کے ہر آن تجدد و تکسیر میں انشقاق حدود ھی جدلیت تامہ ہے جو سب کو انائے واحد کے احوال میں رفتہ رفتہ مرتب کر رھی ہے۔ کائنات کا ارتقاء اسی میلان سے عبارت ہے اس کی نہایت وحدت مطلق ہے۔ اقبال ان فلسفیانہ مقدمات و استخراجات سے گزر کر حقیقت کا نیا کھوج لگاتے ھیں۔ اور عمل و جود کے اندرون میں وہ ایسی منطق کا ادراک کرتے ھیں جو سر تا سر فردیت پسند اور شوق کثرت سے گرم سیر ہے۔ چناں چہ حقیقت تامہ شعور مطلق یا ارادہ بے ہمہ کا سلسلہ صفات و احوال نہیں بلکہ افکار اقبال میں ایک ایسی بے نظیر جدلیت ہے جو صرف عشق سے مخصوص ہے اور جس کا منشاء ہر آن استحکام حدود ہے۔ نتیجتاً کائنات اپنی ساخت میں ایک مجلسی نظام ہے جس میں ہستی غیر محدود، شخصیت لامتناھی، عشق لایزال خود میر مجلس ہے اور تمام کون و مکان عشق کی بزم آرائی ہے۔

عشق میں علم کی سی جدلیت یا موضوع و معروض کے انداز کی ترکیب نہیں ہوتی، بلکہ نسبت ہم جلیسی کی حرکی تقویم ہوتی ہے۔ گردش ایام کا راز یہی تقویم ہے اس لئے تمام ارتقائے کائنات تالیف بزم ہے اور کن فیکون کا ہر تموج اس تحصیل سے رنگین ہے، اسی لئے کائنات ناتمام ہے۔ جو لبریز ہوگیا وہ عشق ھی کیا؟ جو سیر ہوگئی وہ محبت ھی کہاں؟ چناں چہ ارتقاء ہر مقام پر ناصبوری ہے۔ یہ اقبال کی ما بعد الطبیعیات کا حاصل ہے۔

واحدیت پسند فلسفوں کے لحاظ سے اگر کائنات ارتقاء میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابھی ناقص ہے کمال کو نہیں پہنچی اور جب کمال کو پہنچ جائے گی تو تمام ہو جائے گی۔ اقبال کے ہاں ارتقاء کا تصور اس طرح کا نہیں بلکہ ارتقاء ہونا ان کے ہاں عین دلیل کمال ہے اس لئے کہ خوگر حد نہ ہونا اصل وجود ہے۔ چوں کہ کائنات اپنے باطن میں عشق ہے حقیقی عشق وھی ہے جس میں ناتمامیت کی نسبت ہو اس لئے کائنات کی کوئی منزل نہ ہونا اس کمال عشق کا ثبوت ہے جو اس کا راز دروں ہے۔ علاوہ ازیں محبت اپنی فطرت سے حفظ شخصیت ہے، سلب شخصیت اس کی فطرت سے بعید ہے، چناں چہ اس کا سوز دروں دلداری و دلنوازی ہے۔ اس لئے کائنات کا ارتقائی نصب العین شخصیتوں کا استحکام ہے اور اس کی اعلیٰ ترین وجودی شکل انجمن سازی ہے، ایسی انجمن جس کے امکانات لامحدود ہوں، جو کسی منزل پر آ کر تمام نہ ہو جائے۔ عشق کہیں تمام نہیں ہوتا۔ یہ راز کن فیکون ہے۔

خودی کا تار نفس اسی عشق سے قائم ہے۔ ہر خودی عشق کا ہنگامہ ہے اس لئے کہ خدا عشق ہے اور ہر پیکر میں وجود کا دم اسی نے پھونکا ہے۔ چناں چہ

تمام هستیوں میں جوہر ہستی عشق کی ناصبوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذات انسان حرکی اعتبار سے عشق کی جدلیت ہے۔ اسی جدلیت سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے جو اپنے لامحدود امکانات کے ساتھ ہنگامہ کارزار میں قدم رکھتی ہے۔

ہیگل ، براڈلے بلکہ برگسان اور الگزینڈر کے ہاں ہر نعرۂ '' من ہستم '' جو انائے مطلق یا دوران محض سے کم رتبہ کا ہے ایک گذراں پذیر لمحہ ہے محض آنی جانی سرسراہٹ ہے۔ ایک تناقض ہے جو اپنی شکست آپ کی آواز ہے۔ چناں چہ کائناتی جدلیات میں ہر ادعائے ہستی ان کے انکار کی رو سے ایک حادث ارتکاز ہے جس کو کاروان وجود پائمال کرتا ہوا اپنا سفر طے کرتا ہے ، صرف انائے مطلق عبور نا پذیر حقیقت ہے۔ تمام ارتکازات اس حقیقت مطلق کے زمانی شیون و آثار میں تحویل ہو جاتے ہیں جو خود اپنی ذات سے ایک کلی فعال تجربہ ہے چناں چہ تمام تجربات اس کی صرف گریز پا کیفیات ہیں۔ کثرت کا کیا ہے ؟ ہر ادراک یہ کہتا ہے کہ میں ہوں ، ہر آرزو جھنڈا گاڑتی ہے کہ من بودم ۔ مگر میدان وجود میں ہر تجربہ تناقض سے مملو ہوتا ہے اور ہر آرزو مرغ بسمل ہے۔ ادراکات اور تمناؤں کی کثرت جو بظاہر ذوات کی کثرت معلوم ہوتی ہے وہ شکست و ریخت، تغیر تبدل سے دو چار ہوکر ایک وسیع تر ارتسام اور عمیق تر آرزو کے کوائف و صفات ہوکر مفہوم آشنا ہوتی ہے۔ ایسے وسیع تر شعور یا عمیق تر آرزو کی ایک مثال خرد انائے انسانی ہے لیکن یہ انا بھی کوئی قابل اعتبار ہستی نہیں ، اس کا تشخص سراپا تناقص ہے اور اس کا حصول تضادات میں گرفتار۔ انجام کار اس کے ادعائے ذات کے لئے مسماری ہے۔ چناں چہ اس کے حدود ذات متزلزل ہو جاتے ہیں۔ حرکیت وجود اس کو اجتماعی انا کا ایک گزرتا ہوا لمحہ یا صفت فعلی بنا دیتی ہے۔ ذاتیت سے محروم اسی طور اس کا احاطت وجود میں مقام ہے۔ خود انائے اجتماعی بھی کوئی مستقل بالذات فردیت نہیں ہے۔ حیات کائنات کا یہ صرف ایک گزرتا ہوا لمحہ ہے جو اس کے نقش پا سے زیادہ وقیع نہیں ۔ ہستی مطلق کے علاوہ آخر کار کوئی انا موجود نہیں ہے۔ ان تاملات میں انسانی شخصیت کا تکوینی اصول اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہر چھوٹی اکائی بڑی اکائی میں تحویل ہو جاتی ہے اور ہر ذات انجام کار بڑی ذات کی صفت بطور قیام حاصل کرتی ہے۔

اس ساری تگ و تاز میں جو ہیگل ، شیلنگ ، شوپن ہاور سے لے کر بوسانکے ، براڈلے ، برگسان بلکہ الگزینڈر تک ہے شخصیت کے نقطۂ نظر سے اصل نکتہ یہ ہے کہ ہم بزم کائنات کے تصور سے کبھی دو چار نہیں ہوتے۔ بزم کائنات محض کوئی تشبیہ یا اشارہ نہیں ہے بلکہ فلسفۂ اقبال میں یہ ہیکل وجود ہے اور اساسی مقولہ ہے۔ مذکورہ بالا فلسفوں میں '' شہر آرزو '' اور '' محشر خیال '' کے تصورات تک رسائی ضرور ہوتی ہے۔ مگر ان سے سنسار سبھا نہیں بنتی۔ اس لئے

کہ ان کے ہاں تمام تجربات اور آرزوؤں کا عالم ایک قوت فاعلی کی کاہ ربائی میں ہے ، خود انسان میں یہ قوت فاعلی انسانی انا کے روپ میں ہے۔ پیکر انسانی میں ہیجانات کے سب طوفان اصلاً اور وجوداً اس انائے انسانی کے صفات آثار و احوال ہی معلوم ہوتے ہیں جب کہ انجمن صفات و آثار کی کثرت نہیں بلکہ ہستیوں اور اناؤں کی کثرت ہوا کرتی ہے۔

ہیگلی برگسانی وجودیات میں افراد انسانی کی کثرت پر بھی " بزم " کا مقولہ صادق نہیں آ سکتا ۔ اس لئے کہ ان کے تعقلات کے مطابق یا تو افراد ایک دوسرے سے لاتعلق ہیں یا پھر اگر وہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں تو ایک فائق تر انا یعنی ذہن اجتماعی کے پیکر وجود کے اعضائے مختلفہ بن کر ۔ یہ انائے مافوق ، کثرت سوز اور تن تنہا حقیقت ہے باقی سب اس کے احوال و آثار ہیں ۔ خود اس کا خاتمہ بالخیر ، ارتقائے کائنات میں ، ارادہ مطلق کے نمود کامل میں ہوتا ہے۔ غرض اس پورے طرز فکر میں حقیقت کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جس پر بزم یا مجلس کا مقولہ صادق آ سکے ۔ تمام ارتقا حدوث و شکست کا بے پناہ زمانی سیلاب ہے جس میں چھوٹی اکائیاں ٹوٹ کر بڑی اکائیوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں اور آخر کار ایک مطلق اکائی کے مظاہر میں تبدیل ہو جائیں گی ۔ چناں چہ ہر شخصیت اپنی ذات میں اسی ارتقا کا عمل ہے وجوداً نزاعی امر ہے اور انجام کار انفکاک آمادہ ۔

اقبال کا فلسفیانہ وجدان جیسا کہ اوپر گذرا ان افکار کی تردید کرتا ہے۔ ان کے ہاں ارتقا مستحکم اکائیوں اور ان کی فردیت کے استمرار پر مشتمل ہے اور وجہ یہی ہے کہ کائنات کا سر حقیقی عشق ہے ، اور عشق محافظ فردیت ہوتا ہے۔ عشق کی جدلیت ہی ہر انا میں جاری ہے۔ اس لئے انا نزاعی امر نہیں ہو سکتا وہ ذاتاً ایسا امر ہے جو اپنی فطرت سے پائیدار ہے۔

عشق کی حرکیت کا فاعلانہ وجدان " من بودم " ہے۔ یہ فاعلانہ وجدان میں ، " خودی " یا " شخصیت " کی روح ہے۔ اس کا ارتکاز شخصیت کی کاشت کاری ہے۔ ابتدا میں یہ ایک کمزور کونپل ہوتی ہے جو شروع سے ہی ناصبوری سے رنگین رہتی ہے اور اسی ناصبوری سے پرورش پا کر رفتہ رفتہ تناور درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ارتقا اس طرح نہیں ہوتا کہ وجود ذات سے صفات میں آیا ، صفات سے آثار میں آیا ۔ ارتقا کا ایسا تصور واحدیت پسندوں کے افکار سے ہم آہنگ ہے۔ عشقی وجودیات کے نقطہ نظر سے شخصیت کا نمود ایک عمیق جدلیت کا ارتقا ہے۔ اس کا مابعدالطبیعی قانون " ہم جلیسی " کا مضراب ہے۔ چناں چہ ہر خودی ایک مرکز ذات ہے جو بہت سے مراکز ذات کے درمیان

غلطاں پیچاں ہوتی ہے۔ اس کی رگ جاں میں من و تو واو وغیرہ کے آثار ہوتے ہیں ۔ بے قراری ، التہاب ، سوز و ساز سے اس کا بڑھاؤ ہوتا ہے۔ چناں چہ ارتقائے ذات موضوع و معروض کی جدلیت نہیں ہے بلکہ اناؤں کا تعامل ہے اس لئے خودی کا راز دروں انفرادیت کا تجربہ ہے تنہائی کا تجربہ نہیں ۔ اس کی نشاۃ غیریت کو عینیت میں تحویل کرنا نہیں ، بلکہ احترام عینیت اور احترام غیریت ہے اور اسی سے شخصیت انسان کا ارتقاء ہوتا ہے ، اس شخصیت کا ارتقاء جس کی استواری مفہوم ارتقاء ہے منشائے وجود ہے ۔ اس کی شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں تناقص بالذات نہیں ہوتا اور اس میں بزم کائنات کی پائیدار رکن بننے کی غیر محدود صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کا وجود عشق کا وجود ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر روح میں دوسری ارواح کا سودا ہوتا ہے۔ یہی سودائیت خودی کی حقیقت فعال اور منطق سیال ہے ، جدلیت کون و مکاں ہے، سجدہ ملائک ہے ، ہبوط آدم ہے ، صور اسرافیل ہے اور یوم الحساب ہے۔ یہی تو وہ حقیقت ہے جس کے سامنے موت ایک دنبہ کی شکل میں لائی جائے گی اور قربان کر دی جائے گی ۔

صوفیانہ پیغام عمل میں انسانی خودی کو تمام ہنگامہ ہست و بود سے بے نیاز ہوکر محبت خداوند کریم کی دعوت دی جاتی ہے ۔ چوں کہ محبت انسان کا عین الوجود اور اس کی شخصیت کا جوہر ہے اس لئے یہ پیغام عین اپنی فطرت کی طرف لوٹ جانے کی دعوت معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعوت توجہ کی یکسوئی سے اپنے ہر سانس میں ایک ذات کا خیال جاری کرتا ہے۔ سالک باری تعالی کے ذکر کو اپنے قلب میں جاری کرتا ہے ، پھر اور ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے انگ انگ سے یہ ذکر جاری ہو جاتا ہے۔ یہ کیسا عشق ہے؟ اس میں اور عشق لیلی میں کیا فرق ہے؟ دونوں میں یکسوئی ہے ، دونوں میں ترک ماسوا ہے ، دونوں میں خیال جاناں مثل بوئے گل ہر پتی میں ہے۔ غرض اگر سالک ذکر و اذکار میں کھو جاتا ہے تو اس تذکر میں خدا ایسا شخص ٹھہرتا ہے جیسا کہ اور دنیاوی محبوب ہیں ، ایک مخصوص ہستی جس کے چاہ زنخداں میں سارا جہاں گم ، جس کے خال رخ کے عوض سمر قند و بخارا کیا ساری کائنات قرباں ۔ باری تعالی سے اس طور محبت گویا کہ وہ کثرت افراد میں سے ایک فرد ہے کھلی ہوئی آزری ہے ، خدا کا صنم بنا کر دل کے مندر میں بٹھانا ہے ، اس لا محدود غیر متناہی سبحانہ کو محدود ذات و محصور شعور کے طور پر پہچاننا ہے جو اس کی ذاتی شان کے خلاف ہے۔ باری تعالی عشق لامتناہی ہے۔ اگر انسانی قلب کی واردات درست ہوں تو اس عشق مطلق یعنی ذات سبحانہ کی صد پردوں میں ہلکی سی تجلی بھی سالک کو پوری کائنات کے اس پار اتار سکتی ہے ! کائنات کے اس پار ہے کیا؟ عشق کی ناصبوری ، عرش عظیم پر رحمن کا استوا ، جو تمام ہستیوں کا بار اٹھائے ہوئے ہے۔ یہ وہ ذات بے پایاں

و بے کنار ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ۔ لطیفۂ قلب میں اگر تمام ارواح کا سوز دروں جاری ہو جائے تو بھی اس بے پایاں ذات سے قربت ہے ، اس کی معرفت ہے ، افراد ہستی سے بے پایاں محبت ان کی تکمیل سے بے پناہ غرض ۔ یہ مرتبہ اور شخصیت ' انسان کامل ' ہے ۔ اعلیٰ ترین خودی یا شخصیت اسی سوز دروں کی اپنے محدود مرکز وجود میں تنظیم و ترکیب ہے جو اصل کائنات ہے ، اسی کو اللہ کے اخلاق کے ساتھ زندہ ہونا کہتے ہیں ۔ وہ روح جس نے خدا کو ایسے ہی منتخب کیا جیسے بہت سے افراد میں سے کسی ایک فرد سے خصوصیت برتی جاتی ہے ۔ پھر اسی کے دھیان گیان میں لگ گئی ۔ وہ نہ اپنے تک پہنچ سکی نہ خدا تک اس نے خدا کو انسان کی صورت پر اٹھایا ۔ وہ ہوش و حواس میں بھی ہو تو کیا حاصل؟ اس کا وظیفۂ زندگی تو اسمائے الٰہی کا اٹھتے بیٹھتے ورد ہے ۔ یہ ہر آن ایک کیف ہے ۔ یہ تذکر در اصل اچھائی اور برائی کا سقوط ہے اور ایسے شخص کی کمائی بہت ادنی شخصیت ہے ۔ وہ شخص محض جمال پرست ہے عارف صادق نہیں ۔ وجودیات کے نقطۂ نظر سے اس کی زندگی " انائیت " کا اشتہار ہے کیونکہ اس کا حیاتی نصب العین انائے واحد کے جلووں کی ایک علامت میں تحویل ہو جاتا ہے ۔ اس کا وجود گو اصلاً ایک ذات ایک ہستی کا وجود ہوتا ہے مگر اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے وجود کو آثار میں بدل دے ، آثار وجود واحد میں ۔ وہ ذات کی بجائے جلوہ بننا چاہتا ہے ۔ یہ نصب العین اسرار حیات کی تذلیل ہے ، عشق کی جدلیت سے فرار ہے ، ماہیت وجود سے بغاوت ہے ، اور جوہر حق سے تیر آزمائی ہے ۔ وہ شعلۂ طور تو بن سکتا ہے مگر عشق موسیٰ کلیم اللہ ہے ۔ جلوۂ خاکستر کو کیا خبر کہ ذات کیا ہے اور عشق کیا؟

آثار ذات محبوب میں تحویل پذیری جو صوفیانہ طریق میں ملتی ہے اس کو ہم جذبی انائیت سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ اس سے جو شخصیت تعمیر ہوتی ہے وہ انسان کو سنگ کا ہم سنگ بنا دیتی ہے ۔ اس پورے طریق پر اگر ذات جاذبہ کی طرف سے نظر ڈالی جائے ، جیسا کہ اس سے پہلے تذکرہ آچکا ہے ، تو یہ ذات جاذبہ کی وسعت پذیری ہے ، جذب کرنے والی ہستی کی فتوحات اور عالمگیری ۔ ہیگلی جدلیت اس کو فاعلانہ عقل و شعور کی توسیع قرار دیتی ہے ۔ ہم اس فلسفہ کو ذات فاعلہ کی جانب سے عقلی انائیت سے موسوم کریں گے ۔ عقلی انائیت ایسا طریق حیات ہے جس میں ذات فاعلہ سب عالم پر اس طرح نظر ڈالتی ہے گویا کہ جو کچھ ہے وہ سب اس کا امکان ہستی ہے ۔ اس میں عقل سے مراد ایک مخصوص رویہ ہے جو شخصیت اس رویہ سے پرورش پاتی ہے ، اس کی ایک جہت میں اگر قوت فاعلہ یا انائے ذات ہوتا ہے تو دوسری جہت میں انفعال پذیر ہیئات یعنی غیر انا کا سلسلہ ہوتا ہے ۔ ان دو جہتوں میں یہ شخصیت تمام ہو جاتی ہے ۔ اس

تصور شخصیت میں اپنے سوا ہر موجود غیر انا ہے یعنی محض خارجی موجود ہے جو انا کے سامنے صرف اس لئے ہے کہ اس کے دام وجود میں گرفتار ہو کر اس کا سنگ آستاں بن جائے ۔ ہیگلیت انا اور غیر انا کی اسی جدلیت پر تعمیر شخصیت کرتی ہے اس میں افراد انسانی مابعدالطبعی مستقبل کے لحاظ سے شخصیت اجتماعی کے لئے غیر انا ہیں ۔ اور اسی کے مطابق ان کی وجودیاتی اٹھان ہوتی ہے ۔ اسی بنا پر تو اقبال نے کہا ہے " ہیگل کا صدف گوہر سے خالی " ہیگلی جدلیت سے بہنز انفرادیت پسند افادیتی فلسفہ ہے جو مابعدالطبعی مستقبل کی پیشین گوئی نہیں کرتا اور صرف حال پر نظر رکھتا ہے ۔ اس میں ہر انسان انا ہے اور اس کا تمام ماحول غیر انا ۔ ہر شخص ہوس نمود میں گرفتار ہے گویا عقل اور شعور ایک ایسے تدبر کا نام ہے جس کے ذریعے غیر انا مظہر انا میں تبدیل ہو کر ذات کا سامان عیش و نشاط ، وجہ نمود و نمائش بن جائے ۔ ماہیت عقل کی یہ مخصوص تالیف خاص الخاص مغربی فلسفوں کا پھل ہے خواہ ان کا تعلق واحدیتی نظام سے ہو یا اجمالی کثرتیت کے نظام سے ۔ بہر حال اس عقل سے ایک ایسی شخصیت کا ہیکل تعمیر ہوتا ہے جس کا اندرون تاریک ہے ، جس کی تقدیر بے حضوری ہے جس کا خانۂ دل عشق کی تپش سے خالی ہے ۔ اس کے شعور میں نہ شفقت پدری کا گزر ہو سکتا ہے نہ مہر مادری کا ۔ اس میں نہ دلنوازی ہے نہ پاس داری دوست ۔ اس لئے اس شعور کی سزا تنہائی کا عذاب ہے ۔

دور حاضر مست چنگ و بے سرور — بے ثبات و بے یقین بے و حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا — دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا
آہ یورپ با فروغ و تاب ناک — نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

(بال جبریل پیر و مرید)

ایسے شعور کی سزا تنہائی کا عذاب ہے ۔ اس کی ذات کے ساتھ بہت سا سامان تو ہوتا ہے مگر کوئی ہم جلیس نہیں ہوتا وہ آخر کار بکھر کر پائمال ہوتا ہے اور ایک نئے عذاب تک اس کا ارتقاء ہوتا ہے اور وہ ہے زندگی کے بے معنی ہونے کا احساس ۔ یہ اس کی خود نمائی و خود پرستی کا انجام ہے ۔ اقبال نے جس عقلیت کے خلاف اپنے فلسفۂ خودی میں جہاد کیا وہ یہی اور صرف یہی عقلیت ہے جو کبھی دامن حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی اور جس کا انجام آخر کار بے معنویت کا دردناک عذاب ہے ۔ اس کے بر خلاف خودی زندگی کا گہرا شعور ہے :

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے — شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

(بال جبریل، ۱۰)

ذات کو ذات سے راہ ہے غیر ذات سے نہیں ۔ خودی کا دھارا اصل حیات کے سوتے سے پھوٹتا ہے اس لئے یہ حیات کا بھر پور احساس ہے اور سراپا رہین عشق

جوہر زندگی ہے عشق ، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی
(بال جبریل : فرشتوں کا گیت)

حقیقت کی جھلک علم میں بھی نظر آتی ہے اور ارادہ میں بھی ۔ مگر حقیقت کا بھرپور احساس صرف عشق کی تڑپ میں ہوتا ہے عشق کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اس لئے خودی کسی مقام پر جامد نہیں ہوتی ۔ اس کی فطرت ہر دم فعال ہے سراپا انقلاب ہے ۔ اس کی واردات نو بنو ہوتی ہیں چناں چہ اس کی وسعتیں اتنی بے پناہ ہیں کہ

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدہ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند — میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
(بال جبریل : ۱)

خودی حیات ہے ، حیات آفریں اور حیات پرور ہے ۔ اس کے وجود میں سب کا حال اور اس کی نظر میں سب کا مستقبل ہوتا ہے ۔

جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟

اقبال کہتے ہیں کہ " زمین و آسمان و کرسی و عرش ، خودی کی زد میں ہے ساری خدائی " ۔ یہ عشق کی بدولت ہے کہ اس کے جمال میں نوازش اور جلال میں بے نیازی ہوتی ہے ۔ خودی کی اس بے میل اور انمول ناصبوری کا تذکرہ جو باعث حیات ہے انہوں نے اس طرح کیا ہے :

کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذت وصل — خوش آتا ہے کبھی سوز جدائی
پریشاں کاروبار آشنائی — پریشاں تر میری رنگین نوائی
(بال جبریل ، ۱۱۷)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل ہر جگہ موجود ہے ۔ ہر ایک کا ہمساز و ہمدم ہے ۔

ہر ایک ذرہ میں ہے شاید مکین دل — اسی جلوت میں ہے خلوت نشین دل
اسیر دوش و فردا ہے ولیکن — غلام گردش دوراں نہیں دل

اسی دل ، اس کے احساس دروں ، سوز نہاں ، تب و تاب سے وہ شخصیت تعمیر ہوتی ہے جو اقبالی فکر کا مطمح نظر ہے - یہی حقیقت کائنات کی راز داں ہے - انسانی خودی عشق کا محدود مرکز ہے مگر اس کے مقامات لا محدود ہیں -

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

(بال جبریل ، ۹)

یہ عشق ہی ہے جس کی وجہ سے پورے وجود میں تلاطم ہے :

فریب نظر ہے سکون و ثبات   تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھیرتا نہیں کاروان وجود   کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

(بال جبریل ، ساقی نامہ)

بال جبریل کا " ساقی نامہ " اقبال کی وجودیات کو سمجھنے کے لئے مشعل راہ ہے - اس میں اس حکیم کے وہ افکار قلمبند ہیں جو اس کی پوری فکری زندگی کا نچوڑ ہیں - وہ بیان کرتے ہیں کہ زندگی میں مزاق دوئی پایا جاتا ہے - مذاق دوئی سے فلسفہ یورپ میں مراد " عالم و معلوم " " موضوع و معروض " کی دوئیت ہے - مگر یہاں ساقی نامہ میں ، کثرت مراد ہے اور عشق کی طرف اشارہ ہے - اقبال کہتے ہیں کہ " زندگی فراق دوئی سے بنی زوج زوج " - آب و گل کی صحبت گر چہ اس کے لئے گراں ہے مگر " خوش آئی اسے محنت آب و گل " - چناں چہ یہ اسی کی بے پایاں محبت کا نتیجہ ہے کہ آب و گل کے قوام سے انسان پیدا ہوئے - اقبال اس کے بعد جذبی انائیت اور عقلی انائیت کے بر خلاف حقیقت وجود اس طرح بیان کرتے ہیں :

یہ عالم یہ بت خانہ شش جہات   اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں   کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں   مگر عین محفل میں خلوت آفریں

پھر وہ کہتے ہیں :

فریب نظر ہے سکون و ثبات   تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

اس وجودیاتی پس منظر میں وہ انسانی خودی پر سے پردہ اٹھاتے ہیں - جیسا کہ اوپر کے افکار سے واضح ہو جاتا ہے عشق لامحدود ، محدود مرکزوں میں آ کر اپنی تکرار نہیں کرتا بلکہ محدود مرکز کو اس کی اپنی ہستی سے نوازتا ہے -

چناں چہ وہ ایسے زندہ نوری مرکز بن جاتے ہیں جن میں لامحدود کی تکرار نہیں ہوتی ۔ یہ محدود مرکز اپنی گہرائی میں بذات خود عشق اور شوق سے عبارت ہیں۔ چناں چہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے اور اپنے ہونے کا احساس اس تلوار کی دھار ہے۔ اقبال مزید کہتے ہیں :

خودی کیا ہے راز درون حیات   خودی کیا ہے بیداری کائنات

خودی جلوہ بد مست و خلوت پسند   سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک   من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

خودی محض من بودم من بودم کی تکرار نہیں ہے نہ اس سے پیدا ہو سکتی ہے۔ محض من بودم تو انائیت ہے وجودی تنہائی ۔ خودی کا تار نفس " من و تو " ہے، نسبت "ہم جلیسی" سے اس کی نمود ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ عشق ہے۔ عشق میں ایک جدلیت ہوتی ہے وہ من و تو سے عبارت ہوتا ہے مگر من و تو میں ناتحویل پذیر۔ اس کی یہ ماورائیت ہی اس کو من و تو میں گرم سیر رکھتی ہے چناں چہ:

سفر اس کا انجام و آغاز ہے   یہی اس کی تقویم کا راز ہے

ایک دوسری نظم میں اقبال نے اس مفہوم کو اور بھی واضح کیا ہے۔ فرشتے آدم کو رخصت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے روز و شب کی بے تابی عطا ہوئی ہے۔ اگرچہ تیری نمود خاک سے ہوئی ہے مگر کوکبی و مہتابی تیری سرشت میں رکھی گئی ہے۔ تیری میٹھی نیند ہزار ہوشمندی سے بہتر ہے اس لئے کہ تیرا گریۂ سحر گاہی گراں بہا ہے۔

تیری نوا سے ہے بے پردہ ضمیر کائنات
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

" نوائے سروش " جاوید نامہ میں زاہد ظاہر بین سے خطاب ہے کہ تو خودی کو فانی دیکھتا ہے لیکن تو طوفان کو اس حباب کے اندر نہیں دیکھتا ۔ یہ وہ سحاب ہے جس میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں مہاتما بدھ کی زبان فیض ترجمان سے ایک پیغام عالی شان دلواتے ہیں :

در طریقے کہ بنوک مژہ کاویدم من
منزل و قافلہ و ریگ رواں چیزے نیست

بگذر از غیب که این وہم وگماں چیزے نیست
در جہاں بودن و رستن ز جہاں چیزے ہست
آں بہشتے که خدائے بتوبخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عمل تست جناں ، چیزے ہست
راحت جاں طلبی؟ راحت جاں چیزے نیست
در غم ہم نفساں اشک رواں چیزے ہست

جس ذات میں وہ تقدیر بیدار ہو جاتی ہے که جس کے سامنے منزل و قافلہ اور گرد سفر (سے امتیازات) بے معنی ہو جاتے ہیں جس میں یہ شان استغنا پیدا ہو جاتی ہے که وہ جہاں میں رہتی ہے مگر اس سے صاف گزر جاتی ہے که بخشش پر زندہ رہنے کی بجائے اپنے عمل سے اپنی جنت تعمیر کرتی ہے اور جو آرام کوشی کو نہیں جاتی بلکہ ہم نفسوں کے درد سے اشک رواں معلوم ہوتی ہے وہی ذات ہستی کا مصداق ہے اور اسی ذات پر اس شخصیت کا اطلاق ہوتا ہے جو فلسفهٔ اقبال کا موضوع ہے - یہ وہ خودی ہے جو نیستی پر غلبہ پالیتی ہے - اس کے تجربات عمیق اور اس کی واردات بے مثال ہوتی ہیں - انائیت پر اٹھائی ہوئی شخصیت کے تجربات محض سطحی ہوتے ہیں اس کی واردات میں یا تو خود سپردگی ہوتی ہے یا دیگر اندوزی -

خودی کی گہرائیوں سے جس شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اس کی واردات اور تجربات پر اسمائے ہستی کا اطلاق ہوتا ہے - اس کے شعور میں تقدیس ہوتی ہے سلامتی ہوتی ہے ، جباری ہوتی ہے ، قہاری ہوتی ہے - خلاقیت ہوتی ہے - عزت ہوتی ہے - جس انسان میں یہ خودی زندہ ہوتی ہے وہ خلاق ہوتا ہے - فاتح ہوتا ہے ، بری ہوتا ہے - مرید اور حافظ ، قادر ، محصی ، قوی ، ودود ، راشد ، ہادی، رقیب ، رحیم و کریم ہوتا ہے گویا سب اسمائے حسنی کی اسمیں تجلیات ہوتی ہیں- اور اسمائے حسنی ہیں کیا؟ عشق بیکراں کے نشان ہائے بیکراں - انسان کے نقطهٔ نظر سے یہ اللہ کے اخلاق پر اٹھایا جاتا ہیں -

عشق بیکراں صرف گداز کا نام نہیں ہے نہ ہی رقت قلبی کا - اس کی وجودی گہرائیوں کا اندازہ اسمائے حسنی سے ہوتا ہے - اسمائے حسنی جن کا لامحدود اطلاق صرف باری تعالی پر ہوتا ہے المنتقم سے لے کر الرحیم تک ہیں - الجبار و القہار سے لے کر الحلیم تک ہیں- والصبور تک ہیں- وہ المانع ہے اور الباسط ہے - ان کو الگ الگ دیکھیں تو نعوذ باللہ خداوند قدوس کسی نواب کی طرح من موجی

معلوم ہوتا ہے ، جب چاہا الجبار جب چاہا الرقیب اور جب چاہا الودود ۔ لیکن اگر ان اسما کو حقیقت عشق کی تجلیات کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ سب عظیم ترین حیاتی حقائق معلوم ہوتے ہیں۔ الممیت ہونا بھی ثبوت عشق ہے اور المحی بھی ۔ المحیط بھی عشق ہے المجیب بھی عشق ، العزیز بھی عشق اور القوی بھی عشق ۔ یہ اسلام کا تصور شخصیت ہے ۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اسی عشق کے عمیق تجربہ پر زندگی کی استواری اخلاق باللہ پر شخصیت کی تقویم ہے ، زندگی میں ان ہی اسمائے عظمی کی کاشت کاری ہے ۔ یہ ایک ایسی عظیم شخصیت کی تعمیر ہے جو زمین اور آسمان میں نہیں سماتی بلکہ زمین و آسمان اس میں سما جاتے ہیں ع

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال ، لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال ، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب ، عشق ہے ام الکتاب
(ضرب کلیم : علم و عشق)

آں چہ در آدم بگنجد عالم است ۔ آں چہ در عالم بگنجد آدم است
(جاوید نامہ خلافت آدم)

اقبال کے حضور میں

مرتبہ

سید نذیر احمد نیازی

اقبال کی زندگی کے آخری سالوں میں سید نذیر احمد نیازی صاحب کو اقبال کے پاس رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ کتاب اسی دور سے متعلق اقبال کے افکار پیش کرتی ہے۔

اقبالیات میں ایک بیش بہا اضافہ

زیر طبع

اقبال اکادمی۔ کراچی